عربی تنقید کا عہدِ زرّیں

(از جناب سید محمد ہاشم صاحب ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

تنقید کیا ہے؟ ادبی حیثیت سے کسی فن پارے پر غور و خوض کر کے اس کے معیار کا تعین کرنا ہی تنقید ہے ادب اور سماج کا بہت گہرا تعلق ہے۔ سماج کے بغیر ادب کا تصور ممکن نہیں اور ادب نہ ہو تو وہ سماج ناقابلِ تسلیم ہوتا ہے۔ زمانے کے تقاضوں کے مطابق وقتاً فوقتاً سماج کے ڈھانچے میں تبدیلی آتی رہتی ہے جسے ترقی کا نام دیا جاتا ہے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ادب بھی تبدیلی و ترقی کے مراحل طے کرتا ہے لیکن ترقی کے عنوان سے ماضی کی اقدار و روایات کو یکسر نظر انداز کر دینا مناسب نہیں، ہر تخلیق کے دامن میں تنقیدی جوہر پنہاں ہوتے ہیں۔ ابتدا میں یہ تنقیدی نقوش کچھ غیر واضح مبہم اور بے ڈول سے ہوتے ہیں اور ترقی کرنے کے بعد ایک منزل وہ آتی ہے جب تنقید کی کتابیں وجود میں آجاتی ہیں۔

عربی زبان لسانی، عمرانی اور ادبی لحاظ سے دنیا کی افضل ترین زبان ہے۔ عہدِ جاہلیت میں اس کی شاعری نے آسمان کی بلندیوں کو چھو لیا تھا، امراؤ القیس، نابغہ ذبیانی، طرفہ اور زہیر جیسی باوقعت شخصیات اسی دور کی پیداوار ہیں۔ ظاہر ہے ان کی تخلیقات میں تنقیدی شعور بھی وافر مقدار میں ملتا ہوگا۔ لیکن اس وقت سے حضرت حسان بن ثابتؓ اور متنبی کے عہد تک تنقید کے موضوع پر کوئی اہم تصنیف وجود میں نہیں آئی تھی۔ عباسی دور میں عربوں کا علمی شغف اس درجہ ترقی کر گیا تھا کہ یونان کی بیشتر تصانیف و علوم کا عربی میں ترجمہ کرا لیا گیا۔ ارسطو کی تصنیف کی ہوئی دنیا کی پہلی تنقیدی کتاب "بوطیقا" کا ترجمہ بھی عربی میں ہوا۔ اس کے مواد سے تو عرب بہت زیادہ متاثر نہیں ہوئے البتہ اس کا

موضوع یعنی فنِ تنقید اور اس میں ادبی مباحث کی نوعیت نے ان پر جادو کا اثر کیا۔ اور نقادوں کے ذہنوں کے نہاں خانوں میں پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقعہ مل گیا۔ اور بتدریج تنقید کی کئی کتابیں وجود میں آگئیں۔ ان نقادوں میں محمد بن سلام الجمحی، ابن قتیبہ، عبداللہ ابن المعتز قدامہ ابن جعفر، ابن اشیق، ابن خلدون، جاحظ، ابو ہلال عسکری اور عبدالقاہر جرجانی وغیرہ خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔ انھیں کے طفیل طبقات و تذکرے، موازنے و محاکمے وغیرہ کے ذریعہ ادب کی پرکھ کے معیار سامنے آئے۔ ان معیاروں میں جو چیزیں بنیاد بنائی گئیں وہ علم معانی، بیان، بدیع، قافیہ اور عروض تھیں۔ علم بیان میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ، علم معانی میں حذف و ذکر حصر و قصر، وصل و فصل اور ایجاز و اطناب وغیرہ اور علم بدیع میں دیگر تمام محاسن کلام سے بحث کی گئی یوں کہا جا سکتا ہے کہ بلاغت ہی تنقید کی بنیاد قرار پائی۔

یہ تنقیدی پیمانے صرف شاعری تک محدود نہیں تھے بلکہ نثر و نظم دونوں پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے ابن قتیبہ نے ایک طرف کتاب الشعر والشعرا لکھی تو دوسری طرف "ادب الکاتب" میں نثر سے متعلق بھی اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں نثر نگار کے لئے قتیبہ نے چند شرائط پیش کی ہیں:

نثر نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اکثر علوم و فنون کے ابتدائی مسائل سے با خبر ہو۔ مثلاً صرف و نحو۔ حکمت، ہندسہ، حدیث، فقہ وغیرہ

سب سے زیادہ ضروری چیز نثر نگار کے لئے یہ ہے کہ وہ مذاق سلیم اور طبع مستقیم کا مالک ہو۔ زبان کی اصلاح سے پہلے نفس کی اصلاح اور تہذیب الفاظ سے پہلے تہذیبِ اخلاق ضروری ہے اور خصوصیت کے ساتھ دشنام طرازی، بدگوئی، فحاشی سے اجتناب لازم ہے۔

اس کا کلام تعقید، غرابت اور وحشت وغیرہ سے پاک ہو۔

مخاطب یا مکتوب الیہ کے احوال و مراتب کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ ایجاز و اطناب کے مختلف مواقع بھی جانتا ہو۔ اس لئے کہ ہر مقام کے لئے جداگانہ مقال ہوتا ہے[۱] "

---

[۱] ادب الکاتب ص ۷-۶

ابن خلدون نے بھی نظم و نثر دونوں کو موضوع بحث بناتے ہوئے لکھا ہے:-

انشاپردازی کا ہنر نظم میں ہو یا نثر میں، محض الفاظ میں ہے، معانی میں ہرگز نہیں معانی صرف الفاظ کے تابع ہیں اور اصل الفاظ ہیں۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں۔ پس ان کے لئے کسی ہنر یا اکتساب کی ضرورت نہیں۔ اگر ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ان معانی کو کس طرح ادا کیا جائے ۱؎ "

اس دور میں نثری ادب کا زیادہ چلن نہیں ہوا تھا۔ اس لئے نثر سے متعلق تنقید بھی زیادہ نہیں ملتی۔ اور یوں بھی عام طور سے تنقید نثر سے زیادہ نظم کا حصہ سمجھی جاتی رہی ہے۔ آج باوجودیکہ نثری اصناف کی ترقی کافی تیزی سے ہو رہی ہے، لیکن شاعرانہ تنقید کا تناسب نثر کے مقابلے میں بیشتر ہی ہے۔

عربی ناقدین میں محمد بن سلام الجمحی کا نام سرفہرست ہے۔ جس نے "طبقات الشعراء" لکھ کر عربی میں باقاعدگی کے ساتھ تنقید کا آغاز کیا۔ اس کتاب میں شعرا کو طبقات، درجات (CATAGORIES) میں تقسیم کر کے ان کے کلام کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نقاد نے شاعری پر ایک فن، ایک کاریگری اور ایک صنعت کی حیثیت سے غور کیا اور شاعر کو صانع قرار دیا۔

شعر ایک صناعت اور ثقافت ہے جسے اہل علم دیگر اصناف و صناعات کی طرح جانتے اور پرکھتے ہیں۔ بعض صناعات کا تعلق آنکھ سے ہے اور بعض کا کان سے، بعض کا استحکام ہاتھ سے ہوتا ہے اور بعض کا زبان سے۔ مثلاً گوہر و یاقوت کی معرفت وزن اور وصف سے کبھی حاصل نہیں ہوتی جب تک کوئی مبصر آنکھ سے مشاہدہ نہ کرے۔ درہم و دینار کی پرکھ بھی ایسی ہی ہے۔ ان کی خوبی رنگ، لمس، نقش اور وصف سے محسوس نہیں کی جا سکتی۔ ایک نقاد دیکھ کر ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کھرا ہے یا کھوٹا، ٹکسالی ہے یا ٹکسال سے باہر۔ یہی حال ان تمام چیزوں کا ہے جو مختلف ممالک میں بنتی اور تیار ہوتی ہیں۔ اہل نظر ان کو دیکھ کر ہی بتا سکتے ہیں کہ ان کی بناوٹ کیسی ہے اور وہ کس ولایت کی ہیں۔ غلام اور کنیز کی معرفت بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ ایک لونڈی کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ اس کا رنگ

۱؎ - بحوالہ مقدمہ شعر و شاعری، از حالی، ص ۴۵ (یہ بامحاورہ اور آزاد ترجمہ ہے۔ اصل ترجمہ آگے ابن خلدون کے بیان میں پیش کیا گیا ہے۔

نکھرا ہوا ہے، آنکھیں شراب کے دو جام ہیں، ناک کتارا سی ہے، بال لانبے اور گھنے ہیں لیکن پھر بھی سو دو سو درہم سے زیادہ میں فروخت نہ ہو سکے گی۔ دوسری ہزار دو ہزار میں فروخت ہو جائیگی لیکن ایک تر زبان ادیب اس سے زیادہ اس کی اور کوئی تعریف نہ کر سکے گا۔ سلہ "

گویا ابن سلام کے نزدیک شاعری ایک ایسی صناعت ہے جس کا ادراک تو کیا جا سکتا ہے لیکن الفاظ کے ذریعہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ابن قتیبہ کے زمانے میں قدیم وجدید کی بحث کافی زور پکڑ چکی تھی۔ کچھ لوگ محض قدامت اور کلاسیکیت کے مؤید تھے اور صرف قدیم شعرا ہی کو مستند تصور کرنے لگے تھے، دوسرے گروہ کے لوگ جدیدیت کے قایل تھے۔ اس نقاد نے ایک نیا فلسفہ پیش کیا جس کی رو سے قدیم وجدید کی بحث میں پڑنا ہی فضول قرار پایا۔ اس نے شعری تنقید کو ذاتی پسند و ناپسند کے دائرے سے باہر نکالا۔ شاعری اور شاعرانہ خوبیوں کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے شعر کو پرکھنے اور جانچنے کے لئے جو اصول بنائے ان کے نتیجے میں شاعری کو تاثراتی انداز میں جانچنے کے بجائے معروضی انداز میں جانچنے اور پرکھنے کا عمل شروع ہوا شعری تخلیقات کو ادبی گروہ بندیوں، بحثوں، معرکہ آرائیوں، "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" ادھر چلنے کی کوششوں اور اگر زمانہ ساتھ نہ دے تو اس سے نبرد آزما ہونے کے سبب تنقید کے قابل ذکر کارنامے وجود میں آئے۔ قتیبہ نے قدیم وجدید کی بحث پر کاری ضرب لگاتے ہوئے اپنے ساز کا نغمہ ان سُروں میں چھیڑا۔

" اللہ تعالیٰ نے شعر، علم اور بلاغت کو کسی دور کے ساتھ تو خاص نہیں کر دیا ہے بلکہ یہ چیز تو مشترک چلی آتی ہے قدیم چیز اپنے زمانے میں نئی ہوتی ہے اور ہر اچھی چیز ابتدا میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ ہمارے نزدیک اس (جدید) کی بات بنا بر تأخر زمانہ کے یا نو پید ہونے کے بے قیمت نہیں ہو گئی ہے جس طرح ایک ردی بات جو ہمیں کسی قدیم العہد یا کسی شریف آدمی سے پہنچی، بناء بر اس کی شرافت و قدامت کے ہماری نظروں میں بڑی نہیں بن گئی سلہ "

سلہ - طبقات الشعرا ص ۷

سلہ مقدمہ الشعر والشعراء' ابن قتیبہ۔ شعر العرب ترجمہ عبدالصمد صارم صفحہ ۱۳

ہومر کی طرح قتیبہ بھی شعر کو خدائی نعمت شمار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ایک اہم اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے عربی میں آمد اور آورد کا مسئلہ اٹھایا اور اس پر بحث بھی کی۔ آج مولانا حالی شعر کے جس وصف کو 'آمد' کے نام سے یاد کرتے ہیں، قتیبہ نے اسے 'مطبوع' اور 'آورد' کو مصنوع یا 'متکلف' کہا ہے۔ اور وہ خود بھی حالی کی طرح 'متکلف' (آورد) ہی کو پسند کرتا، اور بہترین شعر کی تخلیق کا ذریعہ بتاتا ہے

"متکلف وہ لوگ ہیں جو شعر کو خوب کماتے ہیں اور خوب اس کی تنقیح کرتے ہیں۔ اور بار بار غور و فکر کرتے ہیں[1]"

اس کے نزدیک حطیہ و زہیر وغیرہ اسی قبیل کے شعرا ہیں۔

ابن قتیبہ کی تنقید کا انداز تجرباتی قسم کا ہے۔ اسی لئے شعر کی خوبی و خامی عیاں کرنے کے لئے اس نے کہا میں نے شعر کا تجزیہ کیا تو اس کو چار قسموں میں منقسم پایا[2]"۔ یعنی وہ شعر

(۱) جس کے الفاظ اور معانی دونوں اچھے ہوں۔ جیسے

'اس کے ہاتھوں میں تیز خوشبودار بید ہے، ہاتھوں میں ہے' ایک حسین و عقیل بلند ناک والے انسان کے۔ حیا سے اس کی نگاہیں نیچی رہتی ہیں اور رعب کی وجہ سے لوگ اس کی طرف نہیں دیکھ سکتے اس سے بات کرتے ہیں تو جبکہ وہ مسکرا رہا ہو[3]۔"

رعب و ہیبت کے بارے میں اس سے بہتر شعر کسی نے نہیں کہا۔ ابو ذؤیب کہتا ہے

"نفس کو جس قدر رغبت دلاؤ بڑھتا جاتا ہے اور جب تھوڑے پر ڈال دو تو قناعت کر لیتا ہے[4]"

---

[1] شعر العرب ص ۲۲ [2] ایضاً ص ۱۲

[3] فی کفّہ خیزرانٌ ریحہ عبقٌ من کفّ اروع فی عرنینہ شممٌ

یُغضِیْ حیاءً ویُغضٰی من مھابتہٖ فما یُکلّم الا حین یبتسمُ

[4] والنفسُ راغبۃٌ اذا رغّبتھا واذا ترُدُّ الی قلیلٍ تقنعُ

مجھ سے ریاشی نے اصمعی سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ عربی اشعار میں یہ سب سے بہتر شعر ہے۔

(۲) ایک قسم وہ ہے کہ الفاظ اچھے اور غیریں ہیں مگر جب غور کروگے تو لاطائل پاؤگے۔ جیسے "جب ہم منیٰ کے فرائض سے فارغ ہو گئے اور ارکان کو چوم چکے اور کجاوے دُبلی اونٹنیوں پہ بندھ گئے اور صبح کے چلنے والے نے شام کے چلنے والے کا انتظار نہ کیا تو ہم ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے اور پتھریلی زمین اونٹنیوں سے بہنے لگی [۱]"

قتیبہ کا کہنا ہے کہ یہ الفاظ مخرج اور رونق کے اعتبار سے اچھے خاصے ہیں مگر جب ان کے معانی پر غور کرو تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ جب منیٰ کے دن پورے ہو گئے اور ارکان کو چوم چکے تو اپنی دُبلی اونٹنیوں پر سوار ہو گئے اور لوگ چلنے لگے کہ صبح کا جانے والا شام کے جانے والے کا انتظار نہ کرتا تھا تو ہم نے باتیں شروع کر دیں اور اونٹنیاں پتھریلی زمین میں چلنے لگیں۔ اس قسم کے اشعار بہت سے ہیں۔

(۳) ایک قسم وہ ہے کہ معنی اچھے ہیں مگر الفاظ کوتاہ ہیں۔ جیسے لبید کا یہ قول [۲]:

"شریف انسان اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور صالح ہم نشین انسان کی اصلاح کرتا ہے"

اگرچہ اس کے معنی میں خوب ڈھلاؤ ہے لیکن آب و رونق کچھ نہیں۔

(۴) ایک قسم وہ ہے کہ لفظ و معنی دونوں کوتاہ ہوں۔ جیسے اعشیٰ کا قول ہے [۳]:

منھ جیسے گل بابونہ، جیسے موسلادھار بادل نے سیراب کیا ہو، جیسے ٹھنڈی شراب کے ساتھ شہد ملا دیا گیا ہو [۴]"

---

[۱] ولمّا قضینا من منیً کل حاجۃ　　ومسّح بالارکان من ھو ماسح

وشدت علیٰ حدب المھاری رحالنا　　ولم ینظر الغادی الذی ھو رائح

اخذنا باطراف الاحادیث بیننا　　وسالت باعناق المطی الاباطح

[۲] ما عاتب المرء الکریم کنفسہ　　والمرء یصلحہ الجلیس الصالح

[۳] وفوہٍ کما اقاحیٌ غذاہ دائم الھطل　　کما شیب براح بارد من عسل النحل

[۴] شعر العرب ص ۱۴۔

قدامہ ابن جعفر نے "نقد الشعر" میں شاعری سے متعلق علمی اور تحلیلی بحثیں کی ہیں۔ ان کی یہ کتاب عربی تنقید میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس میں لفظ، معنی، وزن اور قافیہ کو شعر کے عناصر قرار دے کر ان کے علیحدہ علیحدہ محاسن بیان کئے گئے ہیں۔ الفاظ کو شعر کی روح قرار دیا گیا ہے۔ قدامہ عربی تنقید میں انفرادیت کے مالک اس وجہ سے ہیں کہ انھوں نے ادب اور اخلاق کی بحث اٹھا کر اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک اخلاق کے اعتبار سے معنی کی پستی اور مضمون کی کم وقعتی دعریانی شعر پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اصل چیز شعر کی شعریت ہے جو الفاظ ان کی ترکیب اور معنی تک محیط ہے۔ اخلاق سے شعر کا کوئی تعلق نہیں، یہ دونوں جدا جدا چیزیں ہیں۔ طرز ادا میں حسن ہونا چاہیئے۔ بس یہی آرٹ اور اس کا تقاضہ ہے۔ اس زمانے میں شعر اور بلاغت کے متعلق جو مختلف بحثیں جاری تھیں ان میں سچ اور جھوٹ کی بحث کا بھی ایک مقام تھا۔ حضرت حسان بن ثابت نے جب یہ کہا کہ سب سے اچھا شعر وہ ہے کہ جب سنا جائے تو لوگ کہیں کہ سچ کہا ہے [1] تو قدامہ نے اپنی بحث کے دوران اس قول سے اتفاق نہیں کیا اور " احسن الشعر اکذبہ" کہہ کر بہترین شعر وہ قرار دیا جو سب سے زیادہ جھوٹ ہو۔ شعر کے فن کی طرف جب یہ نقاد مائل ہوا تو اس نے بھی شاعری کو ایک صناعت کی حیثیت سے دیکھا اور کہا۔

" طرز بیان شعر کا اصلی جز و ہے۔ مضمون و تخیل کا بجائے خود فاحش ہونا شعر کی خوبی کو زائل نہیں کرتا۔ شاعر ایک بڑھئی ہے۔ لکڑی کی اچھائی برائی اس کے فن پر اثر انداز نہیں ہوتی [2] اپنے اس نظریے کے ثبوت کے طور پر قدامہ نے امراؤ القیس کے چند اشعار کی خوبیاں بھی واضح کر کے دکھائی ہیں۔ کچھ اسی قسم کا خیال 'عقد السحر' میں بھی پیش کیا گیا ہے۔

بڑا شاعر وہ ہے جو معمولی اور مبتذل مضمون کو اپنے لفظوں میں عظیم الشان اور رفیع بنا دے یا بلند سے بلند مطلب کو اپنے الفاظ کے زور سے پست کر دکھائے۔ یا یہ کہ کلام تو اس مقاصد سے پہلے ہی ختم ہو چکا

---

[1] وانّ اشعر بیت انت قائلہ بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

[2] نقد الشعر۔ قدامہ ابن جعفر بحوالہ اردو تنقید کی تاریخ۔ ص ۱۰

ہو، مگر جب اس کو قافیہ کی ضرورت پڑے تو وہ اسے بطور مجبوری نہ لائے بلکہ اس کے ذریعہ سے معنوں میں ایک خوبی پیدا کردے۔ [1]"

ابن رشیق کی کتاب "العمدہ" میں نقد شعر پر بھرپور تنقیدی شعور و صلاحیت نیز عربی ناقدین میں سب سے زیادہ جامعیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اگرچہ انھوں نے عربی روایت کے مطابق بیشتر دوسرے علمائے فن کی آرا نقل کی ہیں لیکن اپنی زبردست قدرت استدلال کی بدولت ان آرا سے انھوں نے کچھ مخصوص نتائج کا استنباط بھی کیا ہے اور اسی وجہ سے "العمدہ" کو تنقید کی باقاعدہ اور اہم کتاب کہا جاسکتا ہے۔ ابن رشیق نے دوسروں کے جو اقوال نقل کئے ہیں وہ بھی ہمارے موضوع کی تفہیم و توضیح میں معاون ثابت ہوں گے۔ اس لئے ان میں سے چند کو نقل کیا جاتا ہے۔

"اکثر کی رائے یہ ہے کہ شاعری میں الفاظ و صناعت کو معانی پر ترجیح ہے۔ دلیل یہ کہ معانی کے لحاظ سے عالم و عامی سب برابر ہیں، خیال سب کے پاس ہوتے ہیں۔ جو چیز انھیں شعریت کا جامہ پہناتی ہے وہ الفاظ کی جودت، بیان کی سلاست و متانت، ترکیب و تالیف کی خوبی ہے۔ اور یہ تمام تعلق رکھتی ہے الفاظ اور صناعت لفظی سے۔۔۔۔۔ چنانچہ دیکھو شعر کی تنقید ہمیشہ الفاظ سے متعلق ہوتی ہے کہ فلاں لفظ بدنما ہے، وہ بے محل استعمال نہیں ہوا، یہ غلط بندھا ہے، الفاظ سے معنیٰ ادا نہیں ہوئے یہ ترکیب سست ہے اور وہ چست۔ اگر شاعر معانی کو رقیق و متین، شیریں و آبدار، مانوس و معلوم الفاظ، رواں و خوشنما ترکیب میں ادا نہیں کرسکتا تو معانی کی کوئی قدر و منزلت نہیں رہتی۔ [3]"

---

[1] عقد السحر ص ۱۸۵

[2] "العمدہ" بحوالہ مرآۃ الشعر ص ۹۹-۹۸

[3]۔ یہ مقولہ نقل کرنے کے بعد صاحب مرآۃ الشعر نے "معنی پر الفاظ کو ترجیح ہے" عنوان قائم کرکے لکھا ہے: اس دلیل کا ماحصل یہ ہے کہ شاعری میں معانی پر الفاظ کو ترجیح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب معانی عام ہیں، یا خیال موجود، تو شاعری غیر از صناعت لفظی نہیں، یہ مسلم ہے کہ مقصود کلام ہونے کے لحاظ سے معانی مقدم ہوتے ہیں۔ لیکن معانی کو ہر شخص اپنے کلام کے ذریعے سے ادا کرتا ہے، کسی کی خصوصیت نہیں۔

(باقی صفحہ ۲۰۷ پر)

" عبدالکریم بن ابراہیم نے لکھا ہے:

زمان و مکان کے اختلاف کی وجہ سے بھی کبھی فن میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ ایک چیز ایک وقت حسین معلوم ہوتی ہے اور یہی چیز کسی دوسرے وقت بھدی اور بدنما محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایک شہر کے باشندے ایک چیز کو پسند کرتے ہیں اور وہی چیز دوسرے شہر والے ناپسند کرتے ہیں۔ ہم نے ماہر شاعروں کو دیکھا ہے کہ وہ اس اختلاف و تنوع کی رعایت کرتے ہیں اور ہر زمانے میں وہی چیز پیش کرتے ہیں جو پسند کی جاتی ہے اور بار بار استعمال میں آتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھتے ہیں کہ وہ حسنِ اعتدال اور جودتِ صناعت سے خارج نہ ہو جائے۔ مجھے سب سے زیادہ پسند یہ ہے کہ شعر حسن اور سادگی کا جامع ہو۔ وہ کوئی دقیق اور ہنگامی چیز نہ ہو۔ غریب، ثقیل اور وحشی الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے۔ وقت مضمون آفرینی اور آورد سے پاک ہو۔ مشہور امثال، موزوں تشبیہیں اور دل نشین استعارے اپنے دامن میں لئے ہو۔[1]

بہت سے علما نے شعر کی تعریف کی ہے۔ اس سلسلے میں لفظ و معنیٰ اور وزن و قافیہ کی شعر میں موجودگی پر بہت زور و شور سے اختلاف رائے بھی رہا ہے۔ ابن رشیق بھی ان مختلف آرا سے واقف تھا۔ اور اس نے چند لوگوں کی تائید کرتے ہوئے شعر میں لفظ و معنیٰ اور وزن و قافیہ کو تقریباً مساوی حیثیت دی ہے۔ وہ کہتا ہے:

" شعر کی عمارت چار چیزوں سے اٹھتی ہے: لفظ، وزن، معنی اور قافیہ۔ پس یہ اس کی حد ہے۔"[2]

پھر شعر میں وزن اور قافیہ کا مقام مزید متعین کرتا ہوا لکھتا ہے:

" شعر کے ارکان میں وزن اس کا عظیم ترین اور مخصوص ترین رکن ہے۔"[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شاعر ہی ان کے طریقۂ ادا کو کمالِ صناعت کے درجہ تک پہنچاتا ہے۔ اور جب یہ صنعت تمام تر لفظی ہے تو شاعری میں الفاظ یہ معانی کو ترجیح ہونی ہی چاہیئے۔

[1]: العمدہ، ابن رشیق۔ بحوالہ معیار ادب۔ ص ۵۹-۵۸

[2] بنية الشعر اربعة اشياء اللفظ والوزن والمعنى والقافية فهذا هو الحد۔

[3]۔ الوزن اعظم اركان الشعر واولاها خصوصية به۔

" وہ شعر نہیں کہا جا سکتا جس میں وزن اور قافیہ نہ ہو"[1]

وزن، قافیہ اور معانی کی اہمیت اور شعر میں ان کی حیثیت واضح کرتے ہوئے صاحب العمدہ نے اپنے تنقیدی نظریے کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

شعر کو مثلاً بیت سمجھو۔ فرش اس کا شاعر کی طبیعت ہے اور عرش حفظ و روایت (یعنی اساتذہ کے کلام پر گہری نظر ہونا)، دروازہ اس کا مشق و ممارست اور ستون اس کے علم و معرفت ہیں۔ صاحب خانہ معانی ہیں۔ مکان کی شان مکین سے ہوا کرتی ہے۔ وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اوزان و قوافی قالب و مثال کی مانند ہیں یا خیمہ میں چوب و طناب کی جگہ، جن پر خیمہ تنتا اور کھڑا ہوتا ہے۔"[2]

شعر میں شعریت پیدا کرنے کے لئے ابن رشیق حسنِ زبان و بیان اور جدت ادا کو ضروری خیال کرتے ہوئے ان صفات سے معرّیٰ شعر کو شعر کہنے کے لئے تیار نہیں، محض کلام موزوں کہتا ہے وہ بھی تأمل کے ساتھ

" اکثر علما کا قول ہے کہ شعر میں اگر کوئی اچھی مثل، پسندیدہ تشبیہ، عمدہ استعارہ ہے تو وہ شعر ہے ورنہ اس کے قایل کو صرف کلام موزوں کہنے کا شرف حاصل ہے اور بس ---- جب شاعر نہ معنی میں کوئی جدت پیدا کرے، نہ الفاظ میں خوبی و سلاست، نہ کسی بندھے ہوئے مضمون کو زیادہ خوشنمائی سے باندھ سکے۔ نہ اوروں کی نسبت الفاظ کے اختصار پر قادر ہو۔ نہ معانی کا رُخ ایک طرف سے دوسری طرف کو پھیر سکے۔ وہ مجازاً شاعر کہلاتا ہے۔ اوروں پر اس کو جو کچھ فضیلت ہے وہ صرف موزونیت کلام کی ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کوتاہیوں کے باوجود وہ اس فضیلت کا بھی مستحق نہیں رہتا۔"[3]

قدیم و جدید کی بحث میں ابن رشیق نے بھی حصہ لیا ہے وہ دونوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اس کی وضاحت کے لئے اس نے یہ مثال پیش کی ہے۔ "قدیم و جدید شعرا کو ایسے دو شخصوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جن میں سے ایک نے عمارت کی بنیاد رکھی اور اسے مضبوط و مستحکم بنایا اور دوسرے نے اسے نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے سجایا۔ ان میں سے کسی ایک کے بھی مہارتِ فن اور ریاضت بدن

---

[1] وَلَا يُسَمَّى شِعْرًا حَتَّى يَكُوْنَ لَهُ وَزْنٌ وَقَافِيَةٌ

[2] "العمدہ" بحوالہ مرآۃ الشعر حصہ دوم ص ۱۰ [3] ایضاً ص ۱۱

سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اول فنکار ہے تو دوسرا حسن کار۔[۱] "

عربی ناقدین میں ابن رشیق کا مسلک متوازن نظر آتا ہے۔ اس نے ہر بات علماء کی سند کے ساتھ لیکن بہت محتاط انداز میں کہی ہے۔ تنقید میں جس توازن کا ہونا ازبس ضروری ہوتا ہے۔ وہ ابن رشیق کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے جبکہ قدامہ وغیرہ اس سے محروم معلوم ہوتے ہیں مذکورہ بالاخیالات پیش کرنے کے بعد ابن رشیق نے شاعری کے لئے خاص طور سے دو شرطیں لازم قرار دیں۔

اول وہی حفظ و روایت۔ یعنی اعلیٰ درجہ کے مستند شعرا کا کلام یاد ہونا تاکہ وہ ان مضامین سے باخبر ہو جائے جو پہلے استعمال کئے جا چکے ہیں' ان شعری روایتوں سے واقف ہو جائے جو مشق شعرا اور نکتہ رس اساتذہ کے ذریعہ اس تک پہنچی ہیں تاکہ انھیں بنیادوں پر اپنی شاعری کی دیواریں تعمیر کر سکے اور اس کا ملکۂ شاعری مستحکم ہو جائے۔ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ نہ کرنیکا نقصان یہ ہوگا کہ جو شخص اساتذہ کے کلام سے خالی الذہن ہوگا اسے حالی کے لفظوں میں "شعر نہیں بلکہ نظم ساقط از اعتبار یا ٹکسال باہر کہیں گے۔ پس جب اس کا حافظہ بلغاء کے کلام سے پُر ہو جائے اور ان کی روش ذہن کی لوح پر نقش ہو جائے تب فکر شعر کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اب جس قدر مشق زیادہ ہوگی۔ اسی قدر ملکۂ شاعری مستحکم ہوگا۔[۲] "

دوسری شرط بھی ابن رشیق کے بالغ تنقیدی شعور کا پتہ دیتی ہے۔ تمام بڑے شاعر' ادیب اور نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ ادب میں جو چیز پیش کی جائے اس پر بار بار نظر ثانی کرنی چاہیئے اس کے بعد ہی اسے منصۂ شہود پر لایا جائے۔ یہ نقاد بھی اسی بات پر زور دیتا ہے کہ شعر لکھ کر اس پر بار بار تنقیدی نظر سے غور کرنا چاہیئے اور جب تک اس کی طرف سے کلی اطمینان نہ ہو جائے اُسے پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ ورنہ وہ اعلیٰ درجہ کا کلام یا کلامِ بلیغ نہیں کہا جا سکے گا۔

---

[۱] ۔ العمدہ ' باب فی القدماء والمحدثین بحوالہ معیار ادب ص ۵۷

[۲] مقدمہ شعر و شاعری از حالی ص ۷۵

ابن خلدون آٹھویں صدی ہجری کے زبردست عالم ہیں۔ اپنی تاریخ کے مقدمے میں انھوں نے تمام علوم پر اظہار خیال کیا ہے۔ شعر سے متعلق بھی اس میں ایک باب ہے جس میں بہت جامع انداز میں عربی شاعری کے اصول بیان کئے ہیں اور وہاں کی شاعری کا جائزہ بھی لیا ہے۔ عرب میں شاعر کو ایک نعمت غیر مترقبہ تصور کیا جاتا تھا۔ جس قبیلے میں شاعر پیدا ہو جاتا وہ قبیلا اس پر فخر کرتا تھا۔ شاعر ہی سفیر بنا کر بھیجا جاتا، وہی جنگ میں اپنے اشعار کے ذریعہ قبیلے کے لوگوں میں حوصلہ، ہمت اور دلیری کے جذبات کو برانگیختہ کرتا تھا اور جنگ کے نتائج کو بدل دینے کا باعث بھی بن جاتا تھا۔ وہ خود ایک تاریخ ہوتا تھا اور تاریخ ساز بھی۔ اسی لئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

"عرب نے شعر کو نہایت شریف اور باعزت کلام مانا ہے اور اسی لئے انھوں نے اس کو اپنے علوم و تاریخ کا سرچشمہ بنایا اور اپنے صواب وخطا کا معیار قرار دیا[1]۔" شعر کے متعلق دوسرے اہل علم حضرات کی رائے بیان کرنے کے بعد ابن خلدون نے لکھا ہے:-

"دراصل شعر وہ کلام بلیغ ہے جس کی بنا استعارہ اور اجزائے متفق الوزن اور روی پر ہو اس کا ہر جزو اپنے مستقل علیحدہ معنی رکھتا ہو اور عرب کے مخصوص اسلوب و طریقہ پر کہا گیا ہو[2]"

اس کے بعد باب "فی ان صناعۃ النظم والنثر انما ھی فی الالفاظ لا فی المعانی" کے ذیل میں جو خیالات پیش کئے ہیں دراصل ابن خلدون کے نظریے میں انھیں کلیدی حیثیت حاصل ہے:-

ماہرین کلام کو نظم و نثر میں جو خوبیاں برتنی پڑتی ہیں یا اسالیب استعمال کرنے پڑتے ہیں وہ از قسم لفظ ہیں معانی کی قسم سے نہیں ہیں۔ اصل تو الفاظ ہیں اور معانی ان کے تابع ہیں۔ اسی لئے نظم و نثر میں ملکہ پیدا کرنے والا اپنی پوری توجہ الفاظ پر لگاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ظاہر ہے زبان اور گویائی کا تعلق الفاظ سے ہے نہ کہ معانی سے۔ کیونکہ وہ تو دل میں ہوتے ہیں، زبان و گویائی سے انھیں کوئی مطلب نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ معانی کچھ نہ کچھ ہر ایک کے ذہن میں ہوتے ہیں جو وہ اپنی فکری طاقت کے مطابق ظاہر کر سکتا ہے، ان کے سیکھنے کے کچھ معنی نہیں۔ ان کو الفاظ کا جامہ پہنانا اور کلام کی شکل دینا یہ البتہ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۷۱

[2] ایضاً ص ۵۷۳

ایک صنعت ہے جس کی مشق کرنی پڑتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ الفاظ معانی کے لئے بمنزلہ قالب کے ہیں اور مثل ظروف کے۔ جس طرح سمندر سے پانی لے کر مختلف برتنوں میں بھر دیا جائے تو وہ پانی تو ایک ہی ہوگا، ظروف مختلف۔ کوئی سونے کا تو کوئی چاندی کا۔ کوئی سیپ کا تو کوئی کانچ کا یا مٹی کا۔ اسی طرح معانی ایک ہی ہوتے ہیں مگر وہ الفاظ کے مختلف ظروف و قوالب میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ اور الفاظ جس قدر چست، موزوں اور موقع و محل کے مطابق ہوتے ہیں، اسی قدر کلام اچھا، بہتر یا بہت ہی خوب سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ معانی ایک ہی ہوتے ہیں۔ حسن تحریر و گویائی سے ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق مختلف ظروف کی طرح الفاظ کے مختلف سانچوں میں معانی کو ڈھال لیتا ہے۔ [۵]"

---

[۵] مقدمہ ابن خلدون ۵۷۷-

نوٹ:- ابن خلدون کی اصل عبارت درج ذیل ہے جس سے دوسرے ناقلین کے اختلاف کی تصحیح کی جا سکتی ہے

"اعلم ان صناعة الكلام نظمًا ونثرًا انما هي في الالفاظ لا في المعاني. وانما المعاني تبعٌ لها وهيَ اصل فالصانع الذي يحاولُ ملكة الكلامِ في النظم والنثر ...... والّذي في اللِّسانِ والنُّطق انما هو الالفاظ واما المعاني فهي في الضمائر وايضًا فالمعاني موجودةٌ عند كل واحدٍ وفي طوع كلِّ فكرٍ منها ما يشاءُ ويرضي فلا يحتاجُ إلى صناعة وتاليف الكلام للعبارةِ عنها هو المحتاجُ للصناعة كما قلناه وهو بمثابة القوالبِ للمعاني فكما أنَّ الاواني التي يغترف بها الماءُ من البحر منها آنيةُ الذهبِ والفِضّةِ والصّدف والزجاج والخزف والماء واحد في نفسه وتختلف الجودة في الاواني المملوءةِ بالماءِ باختلاف جنسها لا باختلاف الماء كذلك جودة اللغة وبلاغتها في الاستعمال تختلف باختلاف طبقات الكلام في تاليفه باعتبار تطبيقه على المقاصد والمعاني واحدة في نفسها وانما الجاهل بتاليف الكلام واساليبه على مقتضى ملكة اللسان اذا حاول العبارة عن مقصوده

یہاں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ الفاظ کو معنی پر ترجیح دینے کے سلسلے میں ابن خلدون نے باقاعدہ ایک باب قائم کرکے معنی کے مقابلے میں لفظ کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ بالفاظ دیگر آٹھویں صدی میں بھی عربی تنقید اسی مسلّمہ پر قائم تھی جس کا آغاز تیسری صدی ہجری میں ہوا تھا۔

ابن رشیق نے شاعر کو اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کی تاکید کی تھی۔ ابن خلدون اسی کی تائید کرتے ہوئے بات کو مزید آگے بڑھاتے ہیں۔

شعر گوئی کے لئے لازم ہے کہ جلیل المرتبہ شعرائے عرب کے چیدہ چیدہ اشعار یاد کئے جائیں تاکہ بعینہٖ اسی اسلوب و طریقہ پر اشعار زبان و قلم سے نکلنے لگیں ---- چنانچہ جس کو شعرائے عرب کا کلام یاد نہ ہو اس کا کلام آپ دیکھیں گے پھیکا، بھدا، بدمزہ اور شیرینی سے خالی ہوگا بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کے کلام کو نظم کہدیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ اور ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ ایسی حالت میں وہ اشعار کہے نہیں تو زیادہ بہتر ہے۔ لہذا اصول مذکور پر جب اشعار حفظ ہو جائیں اور طبیعت میں شعر گوئی کے لئے امنگ و جولانی محسوس ہو اور طریقۂ عرب مزاج میں چھا جائے تو اب شعر گوئی کی ابتدا کی جائے۔ اب جس قدر مشق زیادہ ہوگی، اسی قدر ملکۂ شاعری زیادہ ہوتا جائیگا اور اشعار عرب کے طریق پر ڈھلتے جائیں گے..... ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اول سے قافیہ کی پابندی کرے اور آخر تک اسے نبھائے[۱]"

"..... اس کے بعد جب اشعار نظم سے فراغت مل جائے تو خود اپنے اشعار پر ناقدانہ نظر ڈالنی چاہیئے۔ اور جب کسی شعر میں کوئی نقص یا سقم دیکھے تو اس کو قلم زد کرنے میں کبھی پس و پیش نہ کرے[۲]"

شعر کہنے کے بعد اس کی تنقیح و تہذیب کے بارے میں بھی ابن رشیق کی رائے پیش کی جاچکی ہے۔ ابن خلدون اس سے پوری طرح متفق ہیں۔ وہ اسی تسلسل میں آگے لکھتے ہیں۔

"..... شاعر کی یہ بھی کوشش رہے کہ ترکیب میں تعقید کی بو نہ آئے۔ کلام کچھ ایسا ہو کہ الفاظ سے پہلے معانی ذہن میں جگہ لے لیں۔ بہتر یہی ہے کہ الفاظ معانی کے مطابق ہوں[۳]۔

—— شاعر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے کلام کو بھرتی کے الفاظ سے بچائے۔ اسی طرح متبذل اور سوقیانہ الفاظ کے استعمال سے بھی بچے کیوں کہ یہ چیزیں بھی کلام کو درجۂ بلاغت سے گرا دیتی ہیں اور کلام متبذل کہلاتا

۱، ۲، ۳ مقدمہ ابن خلدون ص ۵۷۵-۷۶-۵

ہے، بلکہ افادیت سے نکل جاتا ہے اور کلام جس قدر افادیت سے نکلتا ہے اسی قدر بلاغت سے دور تر ہوتا جاتا ہے، کیوں کہ یہ دونوں متقابل رخوں پر قایم ہیں۔[۱]"

یہ آخری بات دلچسپ اور بہت کام کی ہے۔ 'ادب میں افادیت'، ۱۸۵۷ کے ہنگامہ کی دین نہیں، محض حالی کی پیشکش نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے ابن خلدون کے یہاں بھی موجود ہے حالی کے خیال کا ماخذ و منبع دراصل ابن خلدون کا مذکورہ بالا بیان ہے جو نہ صرف سماجی نقطۂ نظر سے ادب کو افادی بنانے کا خواہشمند ہے بلکہ بلاغت اور افادیت کو لازم و ملزوم بھی قرار دیتا ہے اور شاید اس نکتہ تک حالی کی رسائی ہی نہ ہوئی ہوگی یا یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے اس کے پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بہر حال اتنا کہنے میں تامل نہیں کہ 'افادی ادب' کا افادی تصور حالی سے قبل ابن خلدون بھی پیش کر چکے ہیں

ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں اصولِ شعر گوئی سے متعلق ایک نظم "غالباً ابن رشیق ہی کی ہے" کہہ کر نقل کی ہے۔ جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں[۲]

"شعر[۳] دراصل وہ نظم ہے جو مناسب و بر محل ہو۔ ورنہ یوں تو شعر کے اقسام چند در چند ہیں۔ بیان میں پوری وضاحت ہو۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی نظر میں کھب جائے اور بچ جائے۔ گویا اس کے الفاظ چہرہ کی شکل میں ہوں اور ان میں معنیٰ آنکھوں کی مانند۔ تشبیب سہل ہو اور قریب المعنیٰ اور تعریف کھلی سچائی پر مبنی ہو۔

کانوں کو ناگوار گذرنے والے الفاظ چھوڑ دو اگرچہ موزونیت میں ٹھیک ہی کیوں نہ اتریں۔

---

[۱]۔ [۲]۔ ۔۔۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۷۵-۵۷۴

[۳]۔ إنّما الشعر ما ناسب في النظم — وإن في الصفات فنونا
فتناهى من البيان الى ان — كاد حسناً يبين للناظرينا
فكأنّ الالفاظ منه وجوهٌ — والمعاني ركّبن فيها عيونا
فجعلتَ النسيبَ سهلاً قريبا — وجعلت المديح صدقاً مبينا
وتنكّبتَ ما يهجّن في السمع — وإن كان لفظه موزونا
وأصحّ التعريض ما قارب النظم — وإن كان واضحاً مستبينا

اور جب نظم پوری کرچکو تو اپنے اشعار کی خود تنقیح و تصحیح کرو اگرچہ وہ واضح اور صاف ہوں"

تنقید عربی کے ضمن میں عبداللہ ابن المعتز کا ذکر کئے بغیر یہ باب نامکمل رہتا ہے۔ اصلاً یہ تیسری صدی ہجری کے عالم ہیں اور اس لحاظ سے ان کا ذکر ابن رشیق سے قبل ہونا چاہیئے تھا لیکن لفظ و معنی کی بحث کو مسلسل رکھتے ہوئے انھیں موخر کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ معنوی اعتبار سے اپنے کارناموں کے سبب دیگر سبھی نقادوں میں ان کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ انھوں نے تنقید کی وہ راہ اختیار کی جو عربی، فارسی یہاں تک کہ چند برس قبل تک اردو تنقید کے پیچھے بھی سایہ کی طرح لگی رہی۔ یہ تھا دو شاعروں کے موازنے کا طریقہ ابن المعتز اس وجہ سے بھی انفرادیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی دورِ جدید (عباسی دور) میں شعرا جن محاسن کا استعمال کر رہے ہیں، وہ اسی دور کی پیداوار نہیں بلکہ عہدِ جاہلیت میں بھی ملتے ہیں۔ انھوں نے "کتاب البدیع" میں یہ بتایا کہ تمام صنائع و بدائع قرآن پاک میں موجود ہیں اور احادیث میں بھی ان کا خوب استعمال ملتا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن عربی ادب کی مکمل بہترین اور واحد کتاب ہے۔ عہد اسلام کے شعرا بلاغت کے لحاظ سے اسی لئے افضل ہیں کہ انھوں نے قرآن کے اسلوبِ لطافت سے فائدہ اٹھایا اور یہی وہ بات ہے جس نے حسان، جریر، بشار اور فرزدق وغیرہ کو امراؤالقیس، نابغہ زہیر، عنترہ وغیرہ سے ممتاز کردیا۔

عربی تنقید میں موازنہ سب سے زیادہ قابلِ ذکر روایت رہی ہے۔ اردو میں بھی چند برس پہلے تک دو شاعروں کا موازنہ کر کے ایک کے شعر کو آہ اور دوسرے کو واہ کہہ کر مطمئن ہو جانا تنقید کا ایک خاص مسلک تصور کیا جاتا تھا اور کہیں کہیں آج بھی اس جذبۂ تنقید کی چنگاریاں سُلگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ میر و سودا، انشا و مصحفی، آتش و ناسخ، غالب و مومن یا غالب و ذوق، حسن و نسیم اور انیس و دبیر یہ ایسے نام ہیں جن سے ہمارا تنقیدی ادب گرانبار ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی عبداللہ ابن المعتز ہی تھے جنھوں نے عربی تنقید میں موازنے کا درخت لگایا۔ فارسی میں اس میں برگ و بار

آئے اور اس کے ثمرات سے اردو والے بھی مستفید ہوئے۔ ابن المعتز نے موازنے کے لئے حسب ذیل امور پر زیادہ زور دیا ہے۔

جب دو شاعروں میں موازنہ کیا جائے تو ہم معنی اشعار سے کیا جائے جس سے معلوم ہو سکے کہ اس خیال (معنی) کو بہتر طریقہ پر کون ادا کر سکا ہے۔ اگر معنی میں عمومیت ہے تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں کوئی وسعت یا جدّت و ندرت پیدا کی گئی ہے یا نہیں۔

موازنے میں کسی قسم کے تعصب کو دخل نہ ہو۔ محض ذوقِ سلیم کی بنیاد پر شعر کی پرکھ ہونی چاہیئے۔

جن شعرا کا موازنہ کیا جا رہا ہے ان دونوں کی خوبیوں کے ساتھ عیوب بھی ظاہر و واضح کئے جائیں اور

موازنہ بھرپور THOROUGH اور تفصیلی ہونا چاہیئے۔ سطحی مطالعہ کا موازنہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جائے گا۔ وغیرہ

یہ ہیں وہ اہم رجحانات جو عربی تنقید کی ابتدا سے مختلف شکلوں میں ارتقا پذیر ہوتے رہے اور مشرقی تنقید کے ستون قرار پائے۔

ضروری گذارش

ادارہ ندوۃ المصنفین کی ممبری یا برہان کی خریداری وغیرہ کے سلسلے میں جب آپ دفتر کو خط لکھیں یا منی آرڈر ارسال فرمائیں تو اپنا پتہ تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ برہان کی چٹ پر آپ کے نام کے ساتھ درج شدہ نمبر بھی ضرور تحریر فرمائیں۔ اکثر منی آرڈر کوپن پتہ اور نمبر سے خالی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بڑی زحمت ہوتی ہے

(جنرل منیجر)